تعلیمات قرآن اور سماجی زندگی میں اخلاق کا مقام و مرتبہ

مؤلف: حسین جماعتی

مترجم: مولانا سید ظہیر عباس

مطلوبہ الفاظ:

اخلاق، معاشرہ، سماجی اخلاق، قرآن، فرد کی حیثیت، سماج کی حیثیت

مقدمہ

انسان سماجی مخلوق ہے اور محاورہ کی زبان میں "مدنی الطبع" ہے۔ (مطہری، ۱۳۸۰، ۴۳۶،۶) اسے زندگی کا سکون اور اطمینان اپنے جیسے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے میں ملتا ہے۔ اسی طرح دوسروں کے ساتھ تبادلۂ خیالات کر کے کمالات کی سمت آگے بڑھتا ہے اور اپنی مختلف صلاحیتوں کو نکھارتا ہے۔ اسلام سماجی دین ہے اور اس کے پاس سماجی اخلاق کے لئے اصول اور قوانین پائے جاتے ہیں۔ سماجی اخلاق سے مراد وہ اچھائیاں اور برائیاں ہیں جو دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلقات کو کنٹرول کرتی ہیں (علی زادہ، ۱۳۸۹، ۲۳)۔ بالفاظ دیگر سماجی اخلاق کا محور، دوسرے انسانوں کے ساتھ سماجی تعلقات کا برقرار ہونا ہے۔ عام طور پر ہمیشہ اسی پہلو کو اخلاق کہا جاتا ہے۔ عام زبان میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں کا اخلاق اچھا ہے یا بُرا ہے تو اس سے مراد اس کا وہ مزاج ہوتا ہے جو دوسروں سے تعلقات کے وقت ظاہر ہوتا ہے (مصباح یزدی، ۱۳۹۴، ۲۳)۔ جیسے حسن سلوک، عدالت، احسان، حسد اور تکبر۔

قرآن کریم جو دین اسلام کا اہم ترین اور بنیادی ماخذ ہے، اس نے سماجی اخلاق کے بارے میں بہت کچھ بیان کیا ہے مثلاً احسان، محبت، امانت داری، نیکی اور تقوی میں تعاون، قوانین الٰہی کی پابندی، عدالت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر و۔۔۔ کے سلسلہ میں قرآن میں خطاب و عتاب آیا ہے۔

اسی سلسلہ میں، مقالہ نگار کی کوشش ہوگی کہ قرآن مجید کی نگاہ میں سماجی اخلاق کی حیثیت کے بارے میں بیان کرے اور قرآن کی روشنی میں دو اہم ترین موضوعات کا جواب دے:

۱۔ انسان کا سماج کے ساتھ کیسا رابطہ ہے؟

۲۔ سماجی زندگی میں اخلاق کے اہم ترین موارد، کیا ہیں؟

سماج کے ساتھ انسان کا رابطہ

مفکرین کے درمیان ایک زمانے سے اس سلسلہ میں بحث اور گفتگو ہوتی رہی ہے، بعض کی نظر میں انسان فطری طور پر اجتماعی مخلوق ہے لیکن بعض مفکرین کا نظریہ ہے کہ انسان، صرف مجبوری کی وجہ سے سماج کی سمت رُخ کرتا ہے، ایک دوسرے گروہ کا ماننا ہے کہ تہذیب و ثقافت اور سماج میں کوئی رابطہ نہیں ہے اور منفعت طلب عقل، انسان کو سماج سے قریب کرتی ہے۔ اور ایک جماعت کا عقیدہ ہے انسانوں میں سماج اور تہذیب و تمدن کا رجحان ہوتا ہے۔

اس موضوع کے بارے میں قدیمی ترین نظریہ افلاطون اور اس کے بعد ارسطو کا پایا جاتا ہے۔ افلاطون کی نظر میں انسان اپنی ضرورت کی خاطر سماج سے رشتہ جوڑتا ہے (افلاطون، ۱۳۳۵، ۱۱۴)۔ ارسطو کی نظر میں انسان سماجی حیوان ہے (ارسطو، ۱۳۴۹، ۵)۔ اس کا ماننا ہے کہ انسان کی ضرورتیں اسے سماجی ہونے پر مجبور کرتی ہیں۔ (گزشتہ حوالہ، ۲۴۲)

عالمِ اسلام کی بزرگ ہستیوں، جیسے فارابی (فارابی، ۲۰۰۲، ۱۱۹) ابن خلدون (ابن خلدون، ۱۳۷۴: ۷۲) اور علامہ طباطبائی (طباطبائی، ۱۴۱۷، ۹۵: ۴۔۹۶) کا بھی یہی ماننا ہے کہ انسانوں کی ضرورت انھیں سماج سے رشتہ جوڑنے پر مجبور کرتی ہے کیونکہ ان کی مادی اور جسمانی ضرورتیں آپس میں مشترک ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کی آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ انسان کا سماجی ہونا اس کی فطرت میں شامل ہے:

الف۔ ''انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تم میں شاخیں اور قبیلے قرار دیئے ہیں تاکہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو'' (حجرات، ۱۳)

اس آیت میں ایک اخلاقی ہدایت کے ساتھ ساتھ انسان کے سماجی ہونے کا فلسفہ بھی بیان ہوا ہے، مطلب یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اس طرح ہوئی ہے کہ اس نے مختلف قومی اور قبائلی گروہوں کی شکل اختیار کرلی ہے۔ یعنی اگر یہ نسبتیں جو ایک لحاظ سے لوگوں کی مشترکات ہیں اور ایک لحاظ سے ان کے درمیان فرق کا باعث ہیں، نہ ہوتیں تو ان کا پہچاننا ناممکن ہو جاتا اور اس کے نتیجے میں سماجی زندگی مشکل ہو جاتی (مطہری، ۱۳۸۰، ج۲: ۳۳۴)۔ اگرچہ قرآن کی نگاہ میں انسان کا مختلف قوم و قبیلہ کی طرف منسوب ہونا، فطری حکمت اور غرض ہے اور اس طرح کے فرق کا ہونا سماجی زندگی کی شرط ہے لیکن اس کے بعد انسان کی قدر و قیمت کا اصلی اور حقیقی معیار تقویٰ، پرہیزگاری اور خوف خدا کو بتایا ہے، یہاں سے سماجی زندگی میں "اخلاق" کی اہمیت روشن ہو جاتی ہے؛ کیونکہ سماجی زندگی بذاتہ مطلوب نہیں ہے، یعنی سماجی زندگی کا انتخاب اس زندگی کے خاطر نہیں ہے، بلکہ یہ زندگی اس کے لئے صلاحیتوں کے ظاہر ہونے، صحیح تربیت، کمال اور سعادت کا مقدمہ ہے۔ اس لئے، قرآن کریم نے اس جملہ "بیشک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے" کے ذریعہ بتایا ہے کہ سماجی زندگی کا محرک انسان کے دل میں ہے، تاکہ وہ اپنی سماجی زندگی کو خوبیوں اور اخلاقی اقدار سے آراستہ کرے۔ جس طرح قرآن مجید نے دوسری آیت میں، انسان کو سماجی زندگی میں نیکی اور تقویٰ کی دعوت دی ہے: "نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور تعدّی پر آپس میں تعاون نہ کرنا"۔ (مائدہ، ۲)۔

ب۔ اور وہی وہ ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا ہے اور پھر اس کو خاندان اور سسرال والا بنادیا ہے اور آپ کا پروردگار بہت زیادہ قدرت والا ہے۔ اس آیت میں بھی نسبتی اور سببی رشتوں کو جو لوگوں کے درمیان ایک دوسرے سے رابطہ کا ذریعہ اور پہچان کی بنیاد ہے، خلقت کا مقصد اور سعادت کا مجموعی ہدف بیان کیا ہے۔

ج۔ تو کیا یہی لوگ رحمت پروردگار کو تقسیم کررہے ہیں حالانکہ ہم نے ہی ان کے درمیان معیشت کو زندگانی دنیا میں تقسیم کیا ہے اور بعض کو بعض سے اونچا بنایا ہے تاکہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں اور رحمت پروردگار ان کے جمع کئے ہوئے مال و متاع سے کہیں زیادہ بہتر ہے (زخرف، ۳۲)۔ یعنی انسان، سہولیات اور صلاحیتوں کے لحاظ سے ایک جیسے پیدا نہیں ہوئے ہیں؛ اگر ایسا ہوتا تو ہر ایک کے پاس وہی چیزیں ہوتیں جو دوسروں کے پاس ہوتیں اور وہی نہ ہوتیں جو دوسروں کے پاس نہ ہوتیں اور اس صورت میں قدرتی طور پر باہمی ضرورت، رابطہ اور باہمی خدمت نہیں ہوتی، اس لئے خداوند عالم نے انسانوں کو صلاحیتوں اور جسمانی،

روحانی، عقلی اور قلبی ضرورتوں کے لحاظ سے مختلف بنایا ہے۔ بعض نعمتوں کو عطا کرنے میں بعض کو برتری دی اور اس طرح فطری طور ہر ایک کو ایک دوسرے کا محتاج بنایا ہے اور ایک دوسرے سے رابطہ کی چاہت اور سماجی زندگی کا موقع فراہم کیا ہے۔ (مطہری، ۱۳۸۰، ۲: ۳۳۵۔۳۳۶) لہٰذا انسان سماجی زندگی میں دوسروں کے تعاون کا محتاج ہے اور یہی ضرورت اسے دوسرے سے قریب کرتی ہے۔

لہٰذا قرآن کے نقطہ نظر سے سماجی فوائد کو حاصل کرنے کے لئے انسان گوشہ نشینی ترک کرے اور سماج کی طرف رُخ کرے۔ اس وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی سماجی زندگی ایک فطری چیز ہے، یہ زندگی نہ معاہدے سے حاصل ہوتی ہے اور نہ اختیار و اضطرار سے اور نہ ہی زبردستی۔

فرد اصل ہے یا سماج؟

جب یہ طے ہو گیا کہ انسانوں کو سماجی زندگی کی شدید ضرورت ہے، تو اب یہ بھی طے ہو جانا چاہیئے کہ اصل فرد ہے یا سماج؟ یعنی فرد سے الگ، سماج کی اپنی کوئی شناخت اور پہچان ہے یا نہیں؟ کیونکہ اگر فرد سے الگ، سماج کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہ ہو تو فرد اور فردی قوانین کے علاوہ کچھ نہ رہ جائے گا اور سماجی اخلاق کا کوئی مطلب نہ ہوگا۔ اس سلسلہ میں چار نظریات ہیں:

الف) فرد اصل ہے: اس نظریہ کے لحاظ سے سماج کا کوئی حقیقی وجود نہیں رہ جائے گا، کیونکہ اس صورت میں افراد ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں اور عمل کرتے ہیں، گروہ و جماعت کی حیثیت خود بخود ختم ہو جائے گی اور وہ صرف افراد کے درمیان رابطہ کی شکل و صورت کے ضمن میں رہ جائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں فرد پرست کی نظر میں جس طرح ہر خاندان، ماں، باپ اور اولاد سے تشکیل پاتا ہے اسی طرح ہر قوم، تمام افراد کے یکجا ہونے سے تشکیل پاتی ہے اور بس، کسی دوسری چیز سے نہیں۔ درحقیقت، فرد فرد کے جمع ہونے سے سماج بنتا ہے۔ البتہ ہر سماج کے افراد، ریت کے ٹیلے کے ذرات کی طرح نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کے وجود سے آگاہی رکھتے ہیں اور آپس میں رابطہ رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ ریت کا ٹیلہ، ریت کے ذروں کے ڈھیر کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا جبکہ سماج، رشتوں اور رابطوں کے ساتھ افراد کے یکجا ہونے کا نام ہے۔ قابل غور نقطہ یہ ہے کہ افراد کا امتزاج، حقیقی امتزاج نہیں ہے اس لئے "سماج" کو اصل نہیں سمجھا جا سکتا (مصباح یزدی، ۱۳۸۸، ۴۰۔۵۲)۔

ب) سماج اصل ہے: اس نظریہ کے لحاظ سے تمام تر رجحانات، جذبات اور انسانیت سے مربوط ہر چیز، سماجی روح کے زیر سایہ پیدا ہوتی ہے۔ یہ نظریہ، سماج کے اجتماعی خصوصیات پر اصرار کرتا ہے، ان کی نظر میں سماج ایک زمینی حقیقت سمجھتا ہے جو ان افراد سے الگ ہے جو اسے تشکیل دیتے ہیں اور اس کے اپنے اثرات اور خصوصیات ہیں جو فرد میں نہیں پائے جاتے۔ سماج کی حیثیت اصلی ہوتی ہے اور فرد کی حیثیت صرف ضمنی ہوتی ہے۔ سماج ایک "شخص" یا "شخص سے بالاتر" ہے، جس طرح ایک بدن مختلف اعضاء سے تیار ہوتا ہے اسی طرح سماج مختلف افراد سے تشکیل پایا ہے۔ (گزشتہ حوالہ، ۳۳۔۴۰)

ج) فرد اور سماج دونوں اصل ہیں: یہ نظریہ فرد کو بھی اصل مانتا ہے یعنی سماج ایک حقیقی امتزاج ہے جس میں افراد ایک دوسرے میں ڈوبتے نہیں ہیں بلکہ مستقل ہوتے ہوئے اجتماعی شناخت پیدا کر لیتے ہیں۔ جسم اور اعضاء ایک دوسرے کے ساتھ تو ایک نہیں ہوتے لیکن روح، فکر اور جذبات کے امتزاج سے اجتماعی روح، اجتماعی تقدیر اور اجتماعی شناخت پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، انسان، انسانیت کے لحاظ سے گیاہ اور حیوانات کی طرح نہیں ہیں، ایک دوسرے کے لئے اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور اثر پذیر بھی۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ انسان کی اپنی شناخت ختم ہو جائے اور صرف اجتماعی شناخت رہ جائے اس طرح کہ سماج کی جامع شخصیت ہر ہر فرد میں حلول کر جائے۔ یہ ایک طرح کا خاص امتزاج ہے جو اثر انداز بھی ہوتا ہے اور اثر پذیر بھی، لیکن اس کے ساتھ افراد کی شخصیت محو اور نابود نہیں ہوتی، وہ باقی رہتی ہے۔ (مطہری، ۱۳۸۰، ۲۶۴: ۷۔۲۶۵)

قرآن کریم تیسرے نظریے کی تصدیق کرتا ہے۔ قرآن نے، فردی زندگی کے اہتمام، تہذیب نفس کی سفارش اور ظاہری برتاؤ کی تنظیم کے ساتھ ساتھ سماجی زندگی پر بہت زور دیا ہے اور قرآن مجید کی آیات کا ایک بڑا حصہ اس بات سے مخصوص ہے (تحریم، ۶؛ شمس، ۹؛ اعلی، ۱۴؛ زخرف، ۳۲؛ نساء، ۱)۔ قرآن کی آیتوں میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آسمانی کتاب میں انسان کے دونوں پہلوؤں پر توجہ دی گئی ہے اور اس میں کسی طرح کے افراط اور تفریط سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض الفاظ قرآن میں ہیں جن سے سماج کا مفہوم نکلتا ہے، جیسے قوم، قبیلہ، قریہ، طائفہ، ملت، امت اور ناس۔ ان میں سے بعض الفاظ بہت زیادہ تکرار ہوئی ہیں جن سے قرآن کی نگاہ میں سماج کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے (جوادی آملی، ۱۳۸۹، ۳۴۔۳۹)۔

قرآن کی نظر میں ایک سماج کے اعضاء وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی سوچ ایک ہوتی ہے، خواہ وہ ایک دوسرے کے پاس رہ رہے ہوں یا دور اور وہ لوگ زندہ ہوں یا مر چکے ہوں۔ اسی لئے قرآن کریم ایک نسل کو بعد والی نسل کی طرف منسوب کرتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ چونکہ ان لوگوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا اس لئے یہ لوگ ذلت اور خواری کے حق دار ہیں ''فَعَقَرُوهَا فَأَصْبَحُوا نَادِمِينَ، فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ'' (شعراء ۱۵۷۔ ۱۵۸) پھر ان لوگوں نے اس کے پیر کاٹ دیئے اور بعد میں بہت شرمند ہوئے کہ عذاب نے انہیں گھیر لیا اور یقیناً اس میں بھی ہماری ایک نشانی ہے اور ان کی اکثریت ایمان والی نہیں تھی۔ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ''اے لوگو! رضایت اور ناراضگی ہی لوگوں کو ایک محور پر جمع کرتی ہے۔ ناقۂ حضرت صالح کا قاتل ایک ہی شخص تھا، لیکن خدا کے عذاب نے سب کو اپنی گرفت میں لے لیا؛ کیونکہ سب کے سب اس عمل سے راضی تھے، خداوند عالم نے فرمایا: فَعَقَرُوها فَأَصْبَحُوا نادِمين ''زمین دھنسنے کی وجہ سے ایک آواز آئی، جس طرح کی آواز نرم اور ہموار زمین میں گرم لوہا گاڑنے پر ہوتی ہے'' (سید رضی، ۱۴۱۴، ۳۱۹)۔ آیت کے ذیل میں امام علی علیہ السلام کے کلام میں ایک گروہ کی سوچ کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کی بنیاد پر راضی ہونا اور ناراض ہونا، ہر سماج کے اجتماعی ثقافت کا حصہ ہے، سماج کی تقدیر اس سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن کی نظر میں ہر سماج کے لوگ جہاں مستقل ہوتے ہیں وہیں ان کی اپنی ایک پہچان ہوتی ہے اور فرد اور جماعت دونوں برابر سے اصل ہیں۔

سماجی زندگی میں اخلاقیات کی بنیادیں

اب تک جو بیان کیا گیا ہے اس کے پیشِ نظر سماجی زندگی میں اخلاقیات کی اہم ترین بنیادوں کو بیان کیا جارہا ہے:

۱۔ خدا پر ایمان

قرآن کریم کی نگاہ میں ''عقیدہ'' سماج کی تبدیلی میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے اور دوسرے اسباب اس سے قوت پاتے ہیں۔ قرآن میں جہاں سماج کی تبدیلی کی بحث ہوتی ہے وہاں کفر، توحید، عقیدۂ خدا اور قیامت کی گفتگو درمیان میں ضرور آتی ہے اور خدا پر ایمان، روزِ جزا کا یقین اور آسمانی شریعتوں کے اعتقاد کو ترقی اور کامیابی کے عوامل سمجھے جاتے ہیں اور شرک کا سماج کی پستی اور رسوائی کا سبب جانا جاتا ہے۔

قرآن مجید نے سماج کی ترقی اور بلندی کی چوٹیوں کو فتح کرنے کا راستہ، ایمان کو قرار دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: خبردار، سستی نہ کرنا۔ مصائب پر محزون نہ ہونا اگر تم صاحب ایمان ہو تو سربلندی تمہارے لئے ہی ہے (آل عمران، ۱۳۹)۔ ''حقیقی ایمان'' وہی ''خدا پر یقین''، ''خدا پرستی'' اور ''آخرت پر ایمان'' ہے اور تمام نبیوں کی کوشش یہی تھی کہ انسان کو اس منزل تک پہونچا دیں۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے، ہارون کو اپنا وزیر اور معاون بنانے کا مقصد ایمان کی ارتقاء اور خدا پرستی کو بتایا ہے: ''اس سے میری پشت کو مضبوط کردے، اسے میرے کام میں شریک بنادے، تاکہ ہم تیری بہت زیادہ تسبیح کرسکیں اور تیرا بہت زیادہ ذکر کرسکیں'' (طٰہٰ، ۳۱۔۳۴)

خدا پر ایمان، آدمیت کا پہلا مرحلہ ہے۔ انسانیت اور آدمیت، یعنی کوئی روحانی اور اخلاقی امر، خدا پر ایمان کے بغیر بے معنی ہے۔ حق، عدالت، صلح، ایک دوسرے کے ساتھ مل جُل کر رہنا، پارسائی، تقویٰ، امانت اور تمام انسانی خصوصیات، سماجی زندگی کی بنیادیں ہیں، لیکن اگر خدا پر ایمان نہ ہو تو اس کی کوئی گارنٹی نہیں رہتی کہ ان تمام انسانی اور اخلاقی خصوصیات پر عمل ہو سکے۔ اسلام ایک کامل، آفاقی اور ابدی الٰہی دین ہونے کے عنوان سے، خدا پر ایمان کو، اخلاقیات کے نفاذ کا بہترین ضامن سمجھتا ہے۔ اس لئے کہ خدا پر ایمان، انسان کے وجود میں جس قدر رسوخ کرے گا اتنا اسی مقدار میں اس کے اثرات، انسان اور سماج کے گفتار و کردار پر مرتب ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں خدا پر ایمان، انسان کو نیکیوں اور پسندیدہ اعمال و کردار کی رقابت کے میدان میں داخل کرتا ہے اور رشد و کمال کے ایک مرحلہ تک پہونچا دیتا ہے، اس طرح کہ اگر سماج کے زیادہ تر لوگ یہی الٰہی راستہ اختیار کرلیں تو ان میں باطل اور فساد کی خواہش ہرگز پیدا نہیں ہوگی اور وہ کامیاب و کامران ہو جائیں گے، جیسا کہ خداوند عالم نے فرمایا ہے: یقیناً وہ صاحبانِ ایمان کامیاب ہوگئے جو اپنی نمازوں میں گڑگڑانے والے ہیں اور لغو باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں (مؤمنون، ۱۔۳)

قرآن کریم نے خدا پر ایمان کے سماجی اثرات کو مختلف پہلوؤں سے بیان کیا ہے، از جملہ ''حالانکہ انہیں صرف خدائے یکتا کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے'' (توبہ: ۳۱) یہودی اور عیسائی، خدا کے مقابل تسلیم ہونے اور دینِ خدا پر عمل کرنے کے بجائے اپنے عالموں کے حکم کے پابند تھے اور ان کی باطل گفتار پر کان دھرتے تھے۔ خدائے تعالیٰ نے توریت اور انجیل میں انھیں یکتا پرستی کی دعوت دی تھی، لیکن وہ لوگ

معاشرے کے احبار اور رراہبوں کی باتوں میں آکر ایسی چیزوں کو ماننے لگے تھے جو توریت اور انجیل کی نظر میں بلکل غلط تھیں اور اس طرح وہ لوگ شرک کی دلدل میں دھنستے چلے گئے۔ (مدرسی، ۱۳۷۷، ۴: ۱۳۶)

دینِ خدا کا حکم یہ ہے کہ اس کے ماننے والے اپنے کردار کو صراطِ مستقیم اور خدا کی پرستش کی بنیاد پر تنظیم کریں (جوادی آملی، ۱۳۸۹، ۶۱) : اللہ میرا اور تمہارا دونوں کا رب ہے لہٰذا اس کی عبادت کرو کہ یہی صراط مستقیم ہے" (آل عمران، ۵۱) "اسی نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کی جائے کہ یہی مستحکم اور سیدھا دین ہے" (یوسف، ۴۰) کیونکہ سماج کے لوگوں کے درمیان بے ضابطگی کا خاتمہ اور ذہنی سکون، خدا پر ایمان، زبانی اور عملی ذکر اور تقویٰ سے حاصل ہوگا اور یہ سکون و اطمینان معاشرے کے لوگوں کی قدرت کا باعث ہے اور اس سے ان کے درمیان سماجی بے ضابطگی کی شرح کم ہو جائے گی۔ "آگاہ ہو جاؤ کہ اطمینان یاد خدا سے ہی حاصل ہوتا ہے" (رعد ۲۸) "تو اللہ نے اپنے رسول اور صاحبانِ ایمان پر سکون نازل کر دیا اور انہیں کلمہ تقویٰ پر قائم رکھا" (فتح، ۲۶)۔

خدا پر ایمان کا ایک اثر یہ ہے کہ پرہیزگار انسان اپنے کو خدا کے حضور میں پاتا ہے: "کیا پروردگار کے لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ ہر شے کا گواہ اور سب کا دیکھنے والا ہے" (فصلت، ۵۳)۔ "تم دل کی باتوں کو چھپاؤ یا اس کا اظہار کرو خدا تو بہر حال جانتا ہے اور وہ زمین و آسمان کی ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر شے پر قدرت و اختیار رکھنے والا بھی ہے" (آل عمران: ۲۹)۔ انسان کے ظاہری اعمال و کردار کے ساتھ ساتھ اس کی فکریں اور اس کے دل میں آنے والی باتیں، سب خدا کے علم میں ہوتی ہیں۔ یہ عقیدہ، انسان کو ظاہری اعمال و کردار اور دل کے وسوسوں کو کنٹرول کرنے اور اپنی فکر اور نیت کو ہر طرح کی آلودگی سے پاک رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ کیونکہ سماج میں انسان کے طرز عمل، اس کے افکار اور خیالات کا ظہور ہوتا ہے لہٰذا یہ ایک فطری بات ہے کہ اس کے افکار اور خیالات کے کنٹرول سے اس سماجی رویے میں بھی بہتری آئے گی اور گمراہی اور بدسلوکی کی جڑیں خشک ہو جائیں گی کہ جو اسے چوری، جھوٹ، خیانت، دوسروں کے حقوق پامال کرنے، جیسی برائیوں کی سمت لے جاتی ہیں۔ لیکن دوسرے غیر مذہبی مکاتب فکر میں یہ عقیدہ نہیں ہے، چونکہ وہ لوگ قانون کے ذریعہ اخلاقی برائیوں کو روکنا چاہتے ہیں۔ جبکہ تنہائی میں قانون کچھ نہیں کر سکتا ہے اور زیادہ تر جُرم اور خیانت تنہائیوں میں انجام پاتے ہیں اور سماج میں اس کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

اس لئے ایمان اور خدائے وحدہ لاشریک کا یقین، سماجی زندگی میں اخلاق کو فروغ دیتا ہے۔ اس کے مقابل، خدا کا انکار یا خداپرستی میں ضعف، اچھائیوں سے دوری، سماجی مشکلات کی پیدائش کا سبب ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر معرفت اور شناخت کا نتیجہ، ایمان ہے اور ایمان کے نقص و کمال کا اثر انسان پر پڑتا ہے، انسان کی معرفت جتنا زندہ اور عمیق ہوگی اس کا ایمان بھی اتنا زندہ اور عمیق ہوگا۔ جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ علم اور معرفت، ایمانِ خدا کی نسبت، اخلاقی اقدار اور اصولوں میں شمار ہوتے ہیں۔

۲۔ قوانین کا الٰہی ہونا

سماجی اخلاق کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد، معاشرے کے قوانین کا الٰہی ہونا ہے۔ ہر سماج کے قوانین، ایک سانچے کی طرح ہیں جس میں کردار ڈھالے جاتے ہیں۔ اسلام میں قانون کا مرکز، قرآن اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کی سنت ہے، جن میں فردی اور سماجی تمام پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ سماجی زندگی میں قدم رکھنے کے لئے اسے کسی نے یہ نہیں سکھایا کہ اسے سماجی میدان میں اُترنا چاہیئے، اس لئے کہ تہذیب یافتہ اور غیر تہذیب یافتہ دونوں کا فطری محرک، سماج ہے۔ انسان کو سماجی زندگی میں کمال کی منزلوں کو طے کرنا چاہیئے، یہ بات بالکل واضح اور روشن ہے، لیکن جن میں غور و فکر اور کوشش کی ضرورت ہوتی ہے، وہ طرز زندگی ہے، یہاں پر انسان کو الٰہی قوانین کی ضرورت محسوس ہوتی ہے (جوادی آملی، ۱۳۸۹، ۳۶۹)۔

قرآن کریم کی آیات (غافر، ۸۵؛ فتح، ۲۳؛ اسراء، ۷۷) سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ ''سنت'' سے مراد، ثابت قوانین اور ''تکوینی'' یا ''تشریعی'' بنیاد ہے جس میں ہرگز تبدیلی نہیں ہوتی۔ عالم تکوین و تشریع میں خدا نے ایسے قوانین اور اصول بنائے ہیں جو لوگوں کے درمیان رائج آئین کی طرح بدلتے نہیں۔ گزشتہ قوموں میں بھی یہی قوانین حاکم تھے اور آج کی ہر قوم میں حاکم ہے اور آئندہ بھی انھیں قوانین کی حکومت ہوگی (مکارم شیرازی، ۱۳۷۴، ۱۷: ۴۳۵)۔

قرآن کریم نے صاف لفظوں میں بیان کیا ہے کہ سنت ذکر کرنے کا مقصد معاشرے کی اصلاح اور اس کی ہدایت ہے: ''تم سے پہلے مثالیں گزر چکی ہیں اب تم زمین میں سیر کرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے، یہ عام انسانوں کے لئے ایک بیان حقائق ہے اور صاحبانِ تقویٰ کے لئے ہدایت اور نصیحت ہے'' (آل عمران، ۱۳۷۔۱۳۸)۔ اس لئے قرآن کی نگاہ میں قوانین کا الٰہی ہونا، سماجی قانون کی خصوصیت ہے۔ جب

انسان، الٰہی قوانین اور آداب کے قالب میں سماجی اصولوں کا پابند ہو تو وہ اپنی سعادت کا راستہ آسانی سے طے کر سکتا ہے، جس طرح اگر سماج غلط اور غیر پسندیدہ آداب و رسوم کا پابند بن جائے تو سماج برباد ہو جاتا ہے۔

۳۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

دین اسلام نے، دوسرے تعمیری نظام عمل کے ساتھ ساتھ، مسلمانوں کو اس بات کی دعوت دی ہے کہ دوسروں سے لاپرواہ نہ رہیں، بلکہ انھیں اچھائیوں کی دعوت دیں اور برائیوں سے روکیں۔ یہ دو بنیادی ذمہ داریاں (لوگوں کو اچھائیوں کی دعوت دینا اور برائیوں سے روکنا) "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہلاتا ہے"۔

قرآن مجید کی آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، دین کے واجبات کے درمیان عظیم ترین واجب امر ہے، تمام واجبات انھیں دونوں کے سبب پائیدار ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر دین کے اس حکم پر عمل کیا جائے تو اسلامی سماج کے حالات دینی اور اخلاقی تربیت کے لئے مساعد ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر توجہ کم دی جائے یا بالکل ہی ترک کر دیا جائے تو معاشرہ غیر مناسب رفتار و گفتار کا شکار ہو جائے اور لوگوں میں دینی اور اخلاقی تربیت کی صلاحیت برباد ہو جائے گی۔

قرآن کریم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مسلمانوں کے اہم ترین وظائف میں شمار کرتا ہے اور فرماتا ہے: "اور تم میں سے ایک گروہ کو ایسا ہونا چاہئے جو خیر کی دعوت دے، نیکیوں کا حکم دے، برائیوں سے منع کرے اور یہی لوگ نجات یافتہ ہیں" (آل عمران، ۱۰۴) اس آیۂ شریفہ سے استفادہ ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دو قسمیں ہے: ایک فردی قسم، جہاں ہر شخص کو اپنا اخلاقی فرض ادا کرنا ہے اور دوسری اجتماعی اور گروہی قسم، جہاں ہر ایک کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ سب مل کر سماجی برائیوں کا مقابلہ کریں۔ پہلی قسم میں چونکہ فردی پہلو ہوتا ہے اس لئے اس کا فیضان، شخص کی قابلیت میں محدود ہوتا ہے، لیکن دوسری قسم میں چونکہ گروہی اور اجتماعی پہلو ہوتا ہے اس لئے اس کی قدرت کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس لئے اسے اسلامی حکومت کے وظائف میں شمار کیا جاتا ہے (مکارم شیرازی، ۱۳۷۴، ۳: ۳۵۔۳۶)۔

ایک دوسری آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مجاہدینِ راہ خدا اور ناصرینِ دین کا اہم ترین ہدف بتایا گیا ہے: "یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے زمین میں اختیار دیا تو انہوں نے نماز قائم کی اور زکات ادا کی اور نیکیوں کا حکم دیا اور برائیوں سے روکا اور یہ طے ہے کہ جملہ امور کا انجام خدا کے اختیار میں ہے" (حج، ۴۱)۔

قرآن مجید نے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فردی اور اجتماعی اثرات کو بیان کیا ہے، جیسے "صالحین کی صف میں قرار پانا" (آل عمران، ۱۱۴) "مؤمنین کی صف میں قرار پانا" (توبہ، ۱۱۲) "اسلامی سماج کو خدا کی

حمایت اور نصرت کا حاصل ہونا" (حج، ۴۰۔۴۱) "امت اسلامی کی برتری" (آل عمران، ۱۱۰) اور "خوبیوں اور نیکیوں کا سبب ہونا" (نساء، ۱۱۴)۔

لہٰذا اسلام، دوسروں کے اعمال کے متعلق بے حسی کو پسند نہیں کرتا اور ہر ایک اس کی توانائی اور زبان کے اثر کے لحاظ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیتا ہے۔ یہ حکم تمام اسلامی معاشرتی آداب پر فوقیت رکھتا ہے۔ یعنی ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ دوسروں کی معاشرت اور رفاقت میں جب بھی موقع حاصل ہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے۔ اس لحاظ سے، سماج وہ مکان ہے جہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر انجام پاتا ہے؛ کیونکہ فرد اور سماج کی تقدیر ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتی اور ہر ایک کا اچھا اور برا ہونا دوسروں پر اثرانداز ہوتا ہے۔ اس لئے کوئی اس وجہ سے کہ وہ اپنے وظائف پر عمل کر رہا ہے، دوسروں کی سرنوشت سے لاتعلق رہے، صحیح نہیں ہے۔ الٰہی اقدار کی بے توجہی اور ان کی توہین، حتیٰ اگر چند لوگوں کی طرف سے بھی انجام پائے، تو خواہ نخواہ اس کا اثر معاشرہ پر پڑے گا۔ گناہ اور منکرات کو اگر سماج میں اعلانیہ طور پر رائج ہو جائیں، تو یہ ہر ایک کے لئے ضرر رساں ہے اور دیر یا زود سب کے سب اس گناہ میں گرفتار ہو جائیں گے۔ اس جگہ تمام لوگوں کا اسلامی اور انسانی فریضہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرکے پاک و پاکیزہ ماحول پیدا کریں جس میں شیطانی خواہشات اور غیر انسانی رفتار کو سر اٹھانے کا موقع ہی نہ مل سکے اور جو لوگ تعلیم میں مصروف ہیں یا اپنے کار و بار میں مشغول ہیں وہ ناخواستہ طور پر گناہ اور لغزش میں مبتلا نہ ہوں۔

۴۔ حکمرانوں کا طرز عمل

سماجی اخلاقیات کی ایک اور بنیاد حکمرانوں کا عوام کے ساتھ برتاؤ اور رابطہ ہے۔ حکمران طبقہ معاشرے میں حقوق اور اخلاقی احکام کو رائج کر سکتا ہے اور اسی طرح اسے انحطاط اور پستی کی سمت بھی لے جا سکتا ہے۔ نمونے کے طور پر یہاں پر ہم چند اہم ترین اخلاقی نمونوں کو بیان کر رہے ہیں جن سے حکمرانوں کا لوگوں کے ساتھ برتاؤ روشن ہو جائے گا:

۴/۱۔ اظلم اور آمریت سے پرہیز

قرآن مجید نے حکومت کے امور میں، لوگوں سے مشورہ اور ظلم اور آمریت سے پرہیز کو الٰہی حکمرانوں کے شرائط میں جانا ہے۔ ان شرائط کے نہ پائے جانے کی صورت میں حکمراں کی شرعی حیثیت ختم ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی سیاسی حیثیت اور عمومی مقبولیت بھی ختم ہو جائے گی اور حکومت تعطل کا شکار ہو جائے گی۔ اس لئے قرآن

اس بات کی طرف متوجہ کررہا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی عمومی مقبولیت اور حکومت کی کامیابی کی وجہ، آپ کا اندازِ حکومت ہے جس کی بنیاد لوگوں کے مشورے اور ہمراہی اور ہمدلی پر قرار دی گئی ہے:

پیغمبر! یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے لہٰذا اب انھیں معاف کر دو، ان کے لئے استغفار کرو اور ان سے امر جنگ میں مشورہ کرو اور جب ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو کہ وہ بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (آل عمران، ۱۵۹)

۲/۴۔ مہربانی اور عفو و بخشش

اوپر کی آیت میں لوگوں کے ساتھ اسلامی حکومت کے طرز عمل کو بیان کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے مجموعی احکام کا ایک سلسلہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کو دیا گیا ہے جو موارد اور حالات کے لحاظ سے عمومی اور بنیادی احکام پر مشتمل ہیں، لیکن نزول کے لحاظ سے واقعۂ احد کے بارے میں ہے (طوسی، تاریخ اشاعت نامعلوم، ۲۵: ۳؛ مغنیہ، ۱۴۲۴، ۱۸۸: ۲؛ بیضاوی، ۱۴۱۸، ۴۴: ۲) جب مسلمان جنگ احد سے واپس آئے تو جن لوگوں نے میدان جنگ سے فرار کیا تھا، پیغمبرؐ کے پاس آئے اور شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے عفو اور بخشش کی درخواست کی۔ اس لئے خداوند عالم نے اپنے پیغمبرؐ کو عمومی طور پر معاف کرنے کا حکم دیا اور پیغمبر رحمت نے فراخ دلی سے سب کی خطا کو قبول کر لیا اور لطف پروردگار سے لوگوں پر مہربان ہو گئے جب کہ اگر بے رحم اور سنگدل ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے بھاگ جاتے (مکارم شیرازی، ۱۳۷۴، ۱۴۱: ۳)۔ احد کا واقعہ، عفو اور انعطاف کے روشن موارد میں سے ہے اور اگر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معاف کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کرتے تو یقیناً لوگ آپ سے دور ہو جاتے۔

اس لئے، سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۵۹ میں معاشرے پر حکومت کرنے والوں کی اہم ترین خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے اور وہ ہے ان لوگوں کو معاف کرنا جن سے غلطی سرزد ہوئی لیکن بعد میں وہ اپنی غلطی پر شرمندہ ہوئے۔ لازمی بات ہے کہ جو شخص سماج کی رہبری کر رہا ہے وہ اگر تند خو اور بے رحم ہو تو اپنے مشن میں ناکام ہو جائے گا، لوگ اسے چھوڑ دیں گے اور وہ اپنا وظیفہ انجام دینے میں ناکام ہو جائے گا۔

۴/۳۔ لوگوں پر احسان کرنا

''احسان'' یعنی فائدہ پہونچانا اور ''محسن'' وہ شخص ہے جو دوسروں کو فائدہ پہونچائے (طبرسی ۱۳۷۲، ۳۶۳: ۳)۔ پروردگار اپنے ان بندوں پر خاص عنایت کرتا ہے جو اس کے لئے کار خیر انجام دیتے ہیں: [نیکی کرو،

بیشک خدا نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے] (بقرہ: ۱۹۵)احسان کرنے والوں کی ترغیب اور حوصلہ افزائی کے لئے فرماتا ہے: [خدا نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے](عنکبوت:۶۹)۔ دوسری آیتوں میں قرآن مجید نے مختلف الفاظ میں احسان کرنے کی اہمیت کو بیان کیا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام کی نگاہ میں احسان ایک اخلاقی اور سماجی قانون ہےاور انسانی معاشرہ میں ترقی اور خوشحالی کے لئے دوسرے اخلاقی فضائل کے ساتھ، احسان کا پایا جانا ضروری و لازم ہے اور مدینۂ فاضلہ ہر گز ہر گز احسان اور احسان کرنے والوں سے خالی نہیں رہ سکتا۔اسی لئے قرآن کی تعلیمات میں احسان کو اسلامی معاشرے کے سرپرست اور حکمراں کی خصوصیات کے طورپر بیان کیا گیا ہے جس کا درجہ عدالت سے بالاتر ہے یعنی اگر قرآن میں حکمرانوں کا عادل ہونے اور نفس پرستی سے دور رہنے کو ضروری مانا گیا ہے تو عدالت نہ ہونے کی صورت میں اس حکومت کی دینی حیثیت ختم ہو جائے گی، قرآن میں عدالت سے بھی بالاتر، احسان کی بات بھی کہی گئی ہے۔ حکومت کے ذمہ داروں کو اپنے عمل کے لئے بنیادی قانون احسان کو قرار دینا چاہیئے اور حکومت کی بنیاد، رعایہ پروری اور احسان پر ہونی چاہیئے۔قرآن مجید حضرت یوسف علیہ السلام جن کو مصر کی حکومت حاصل ہوئی، ان کے احسان اور اہلِ خیر کی فہرست میں قرار پانے کی بات کی ہے (یوسف: ۵۶) نیز پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ نے اخلاقی فضیلت کی خاطر جنگ احد سے فرار کرنے والوں پر مہربانی کرتے ہوئے عفواور بخشش کو اپنا نصب العین قرار دیا۔

۴/۴۔امانت داری

عقل اور منطق کی نظر میں، سماجی زندگی کے لئے امانت داری ایک ضروری چیز ہے، اس لئے انسانوں کی پاک فطرت اسے پسند کرتی ہے اور امانت میں خیانت سے بیزار ہے۔ اسلامی ثقافت میں بھی [امانت داری] کو سماجی اخلاق کے اصول اور بنیادی شرطوں میں شمار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ''امانت داری کو اسلام کے احکام میں سب سے اوپر قرار دیا گیا ہے'' (لیثی واسطی، ۱۳۷۶، ۲۶۴)۔قرآن مجید، امانت داری کی اہمیت اور ضرورت کے بارے میں فرمارہا ہے:

''اگر تم میں ایک کو دوسرے پر اعتبار ہو تو جس پر اعتبار ہو اس کو چاہیئے کہ امانت کو واپس کر دے اور خدا سے ڈرتا رہے'' (بقرہ، ۲۸۳)۔خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے اہل تک پہونچادو'' (نساء،۵۸)

خداوند عالم کا تمام انسانوں اور مسلمانوں سے مطالبہ ہے وہ امین بنیں اور امانت میں خیانت سے کام نہ لیں اور امانت صاحب امانت کو واپس کر دیں۔ اسلامی سماج کے ذمہ داروں کو ایک مسلمان ہونے کے عنوان سے امانت دار ہونا چاہیئے اور جب تک کسی شخص کے امانت دار ہونے کا یقین نہ ہو جائے اسے کسی طرح کی ذمہ

داری نہ دی جائے؛ کیونکہ حکومت بھی ایک امانت ہے جو لوگوں کے اختیار میں دی جاتی ہے اور ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے کو خدا اور لوگوں کا امین سمجھتے ہوئے، عدالت اور احسان کے اصول کے دائرے میں رہ کر امانت کی حفاظت کریں۔

۵۔ عدالت اور انصاف

عدالت، کی اصل عدل ہے، جس کے معنی برابری کے ہیں (ابن فارس، ۱۴۰۴، ۴: ۲۴۶۔۲۴۷) افراط اور تفریط کے درمیان کا راستہ، اس طرح کہ نہ اس میں زیادتی ہو اور نہ کمی، یعنی اعتدال اور حقیقی عدالت۔ (مصطفوی، ۱۳۶۷، ۸: ۵۵)۔ اسی طرح امام علی علیہ السلام کے بیان کے مطابق: "عدل، ہر چیز کا اس کے مقام پر قرار پانا ہے" (سید رضی، ۱۴۱۴، ۵۵۳)۔ لہٰذا تجاوز، افراط اور تفریط عدالت کی فطری حالت کو ختم کر دیتا ہے۔ سماجی زندگی میں اخلاق کی بنیادوں میں سے ایک قسط اور عدالت ہے۔ مسلمانوں کے لئے اسلام کا حکم یہ ہے کہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں عدالت کی رعایت کریں اور اسے معاشرے میں عام کرنے کی کوشش کریں؛ اس لئے کہ قرآن مجید نے عدالت کو سماج کے استحکام کی بنیاد اور پیغمبروں کی رسالت کے اہداف میں ذکر کیا ہے: بیشک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قیام کریں۔ (حدید، ۲۵)

اسلامی سماج کی بنیاد توحید اور عدالت پر استوار ہے اور اس کی خوشحالی ان دو اعتقادی اور عملی اصول کی پابندی میں ہے، اسی لئے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے اپنے تمام تر اعمال اور نیتوں کی بنیاد، عدالت پر قرار دیں اور فردی اور اجتماعی زندگی کے تمام مرحلوں میں اس کی رعایت کریں۔ (جوادی آملی، ۱۳۸۹، ۳۶۷۔۳۶۸)

خدا تمہیں ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں وطن سے نہیں نکالا ہے اس بات سے نہیں روکتا ہے کہ تم ان کے ساتھ نیکی اور انصاف کرو کہ خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (ممتحنہ، ۸)

قرآن نے سورہ نساء، ۵۴۔۵۷ میں مال اور علم کے اجتماعی وظائف اور سماج کی اصلاح (تعمیر) یا افساد (تخریب) میں ان کے کردار کو بیان کرنے کے بعد بیان کیا ہے کہ علم اور مال کی قدر و قیمت اس وقت ہے جب ان میں دینی اور خدائی ہدف پایا جا رہا ہو اور دونوں سماج کی خدمت کا ذریعہ ہوں، ایک دوسری آیت میں ارباب اقتدار کے وظائف کو بیان کرتے ہوئے حکم دے رہا ہے کہ اس اقتدار کی اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، بلکہ اقتدار، عدالت کے رواج کا ایک وسیلہ ہے۔ (مدرس، ۱۳۷۷، ۹۶: ۲) خداوند عالم تمہیں حکم دیتا ہے۔۔۔ کہ امانتوں

کو ان کے اہل تک پہونچا دو اور جب کوئی فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو اللہ تمہیں بہترین نصیحت کرتا ہے بیشک اللہ سمیع بھی ہے اور بصیر بھی۔ (نساء ۴، ۵۸)

اس لئے عدالت کا رواج، اخلاق کی سطح کو بلند کرنے کے ساتھ ساتھ ، دین کے ارتقاء کا ضامن ہے اور احکام الٰہی کا نفاذ اور گناہوں سے دوری کا راستہ ہموار کرتا ہے، امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: خدا نے عدالت کو معاشرے کی بنیادوں کے استحکام اور ظلم اور گناہوں سے پاکیزگی کو اسلام کی عظمت قرار دیا ہے۔ (تمیمی آمدی، ۱۴۱۰، ۳۴۱)

۶۔ ظلم سے اجتناب

ظلم و زیادتی اور کسی چیز میں عدالت و ظلم ایک دوسرے کے مقابل ہیں؛ اس لئے ظلم، عدالت کی ضد ہے (نراقی، تاریخ اشاعت: نامعلوم، ۲:۲۵۵)۔ ظلم یعنی زیادتی اور کسی چیز کا اس کی اپنی مخصوص جگہ سے ہٹ کر کسی اور جگہ پر اس طرح سے قرار پانا کہ وہ یا زیادتی کی طرف مائل ہو یا کمی کی طرف۔(عسکری، تاریخ اشاعت ۱۴۰۰، ۲۲۶) لہٰذا ظلم اور ستم سے اجتناب کی دعوت، عدالت کی تاکید میں ہے اس لئے جب ظلم و ستم سے دور رہنے کی بات کی جاتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ایک ایسی چیز پر زور دیا جارہا ہے جس کو عدالت کہا جاتا ہے، لہٰذا ایسا عمل جو فطری حالت سے الگ اور جس میں افراط اور تفریط کی سمت جھکاؤ پایا جائے وہ صفت عدالت سے باہر نکلنے کا اہم ترین سبب ہے۔

اسلام میں کسی صاحب حق کے حق کو پامال کرنا حتی حیوان کے حق کو پامال کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے دشمنی، خصومت، کینہ اور بے دینی کی وجہ سے ظلم اور تجاوز جائز نہیں ہو سکتا: "اے ایمان والو! خدا کے لئے قیام کرنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بنو اور خبر دار کسی قوم کی عداوت تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ انصاف کو ترک کر دو، انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو کہ اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے" (مائدہ، ۸)

ظلم سے پرہیز سماج کے لوگوں کی خصوصیت ہونے کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کے شرائط میں سے بھی ہے جیسا کہ قرآن حضرت یوسفؑ کے واقعہ کے ضمن میں فرمارہا ہے: " ان لوگوں نے کہا: اے عزیز مصر اس کے والد بہت ضعیف العمر ہیں لہٰذا ہم میں سے کسی ایک کو اس کی جگہ لے لیجئے اور اسے چھوڑ دیجئے کہ ہم آپ کو احسان کرنے

والا سمجھتے ہیں۔یوسف نے کہا کہ خدا کی پناہ کہ ہم جس کے پاس اپنا سامان پائیں اس کے علاوہ کسی دوسرے کو اسیر بنالیں اور اس طرح ظالم ہو جائیں"(یوسف، ۷۸ – ۷۹)

اقتدار اور حکومت کے زمانے میں بھی حضرت یوسف علیہ السلام کے کردار اور آپ کے رویہ میں نیکی نمایاں تھی آپ کسی پر ظلم نہیں کرتے تھے۔

۷۔دوسروں کے حقوق کا خیال رکھنا

اخلاق کی بنیادوں میں سے ایک یہ ہے کہ سماج کے لوگ دوسروں کے حقوق کی رعایت کریں۔دوسروں کے حقوق کی رعایت کے ضروری ہونے میں کوئی عقلمند انسان شک نہیں کر سکتا،اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تمام میدانوں میں لوگوں کے حقوق کی رعایت کرنااور ظلم و ستم سے پرہیز دین اسلام کا اصلی قانون ہے۔ قرآن مجید دوسروں کے حقوق کی رعایت کرنے کی نصیحت کرتا ہے، قرآن انسانی حقوق کی پابندی کا قائل ہے اس لئے وہ تمام انسانی رجحانات کے لئے اسباب فراہم کرتا ہے اس لئے کہ اس موضوع پر قرآن کی خاص توجہ ہے کیونکہ تمام انسان، خدا کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے خاص حقوق سے بہرمند ہیں اور کسی کو اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسروں کے حق کو پامال کردے ،اس طرح خدا پر ایمان، آخرت کے حساب و کتاب کا عقیدہ، قیامت پر ایمان، انسان کے کردار سازی میں اثرانداز ہوتا ہے اور قرآن کے بیان کے مطابق خداوند عالم کے دقیق حساب و کتاب کو قبول کرنا دوسرے انسانوں کے حقوق کی پابندی کرنے کا اہم ترین راستہ ہے (نساء، آیت ۶۱)دوسروں کے حقوق کی رعایت کرنا، تقویٰ اور پرہیز گاری سے قریب ہونے کا باعث ہے اور تقویٰ ہی دوسروں کے ساتھ جینے کا سلیقہ سکھاتا ہے اور دوسروں کے حقوق کی رعایت کرنے کی طرف رغبت و تشویق دلاتا ہے (سورہ بقرہ، ۲۳۳) جب انسان اس منزل تک پہنچ جاتا ہے کہ اس کی نظر میں دوسروں کی شخصیت اور عزت اپنی شخصیت اور عزت کی طرح ہو جاتی ہے تو وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آتا ہے اور ان کے حقوق کی بھی رعایت کرتا ہے اور ان کے حق میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتا(سورہ،مائدہ ۲)

جو لوگ اس منزل تک نہیں پہنچے ہیں خداوند عالم انہیں دوسروں کے حقوق کا خیال نہ رکھنے پر محکوم کرتا ہے تاکہ وہ اپنی اس روش سے دور ہو جائیں (سورہ نساء،۹) اسی طرح قرآن کریم کسی حق کو اپنے سے مخصوص کرنے اور احساس وظیفہ نہ ہونے کو دوسروں کے حقوق کو ضائع کرنے کے برابر سمجھتا ہے۔اور اہل کتاب کے درمیان ایسے لوگ ہیں کہ جن کو امانت کے طور پر اگر زیادہ مال دیا جائے تو بھی وہ واپس کر دیں گے اور ایسے بھی لوگ ہیں کہ

جن کو اگر ایک دینار بھی دیا جائے تو واپس کرنے والے نہیں ہیں مگر یہ کہ ان کے سر پر مسلط ہو کر زبردستی وصول کیا جائے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا کہنا ہے کہ ہم غیر یہودیوں کی امانت کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ وہ لوگ خدا کی طرف جھوٹی نسبت دیتے ہیں جبکہ وہ جانتے ہیں ان کی یہ بات سراسر جھوٹ ہے (آل عمران، ۷۵)

اوپر کی آیت میں اہل کتاب کا مکروہ چہرہ مشخص کیا گیا ہے کیونکہ یہودیوں کے اک گروہ کا عقیدہ تھا کہ دوسروں کی امانت کی حفاظت کرنا ان کی ذمہ داری نہیں ہے حتیٰ انہیں حق حاصل ہے کہ وہ دوسروں کی امانت کو اپنی ملکیت بنا لیں۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ ہم اہل کتاب ہیں اور خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر اور آسمانی کتابیں ہمارے درمیان آئی ہیں اس لئے دوسروں کے مال کا کوئی احترام نہیں ہے اور دوسروں کے حقوق کی پابندی کرنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے (مکارم شیرازی، تاریخ ۱۳۷۴، ۲: ۶۲۰)

۸۔ صبر اور استقامت

سماجی زندگی میں اخلاق کے وجود کی بنیاد صبر اور استقامت ہے۔ علم و تجربہ اور ثقافتی و معیشتی سختیوں اور مشکلات سے نکلنے کے راستے کے ساتھ ساتھ استقامت و پایداری معاشرے کو بلندی کی طرف لے جاتی ہے، ایک معاشرہ صبر اور استقامت کے ساتھ اپنے بلند و بالا مقاصد کی جانب آگے قدم بڑھا سکتا ہے:

"اے پیغمبر! آپ لوگوں کو (دشمن سے) جہاد پر آمادہ کریں اگر ان میں بیس بھی صبر و استقامت کرنے والے ہوں گے تو دوسو پر غالب آجائیں گے اور اگر سوہوں گے تو ہزاروں کافروں پر غالب آجائیں گے اس لئے کہ کفّار سمجھدار قوم نہیں ہیں" (انفال، ۶۵) بہت سے مقامات پر معاشرے کے مختلف پہلوؤں سے سعادت اور خیر، صبر اور جلد بازی سے پرہیز میں حاصل ہوتا ہے: اور اگر یہ اتنا صبر کرلیتے کہ آپ نکل کر باہر آجاتے تو ان کے حق میں زیادہ بہتر ہوتا (حجرات: ۵)."اور صبر کرنا آپ کے لئے بہتر ہے" (نساء، ۲۵).

ایسا معاشرہ جس کے افراد صابر اور متقی ہوں تو اللہ ان کی اخلاقی بلندی اور مادی و معنوی ترقی و رشد میں ان کی مدد کرتا ہے: "یقیناً اگر تم صبر کروگے اور تقویٰ اختیار کروگے اور دشمن اپنے اسی جوش و خروش کے ساتھ فوراً تم تک آجائیں گے تو تمہارا خدا پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا جن پر بہادری کے نشان لگے ہوں گے " (آل عمران، ۱۲۵).

نتیجہ

سماجی اخلاق، اخلاق اسلامی کا ایک بہت ہی اہم حصہ ہے اس لئے کہ انسان سماج اور اجتماع میں زندگی گزارنے کا محتاج ہے اوراس کی زندگی دوسروں کی مدد کرنے اور دوسروں کی مدد لینے سے جڑی ہوئی ہے، لہٰذا زندگی کے ان موضوعات سے آشنائی اور ان کا خیال رکھنا بہت زیادہ ضروری ہے۔ بہت سے ناپسندیدہ صفات اور گناہ اسی سماج اور آپسی تعلقات و رابطے سے وجود میں آتے ہیں اسی طرح سے بہت سے اچھے اور نیک صفات، فضیلتیں اور ثواب بھی اسی سماج کی خاطر حاصل ہوتے ہیں۔ سماجی زندگی میں اخلاق کی پاسبانی اور رائج ہونے کے لئے ہمیں دینی میدان اور دینی پیش خیمہ کی ضرورت ہے جو در واقع خود ہی سماجی اخلاق سے مربوط مفاہیم کی بنیاد ہیں لیکن ہاں وہ بلند سماجی اخلاق کے لئے میدان فراہم کرتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ معاشرے میں مکارم اخلاق کی تکمیل اور اخلاق کو عام کرنے میں مدد گار عوامل میں سے ہیں۔ اسی لئے قرآن مجید نے ان امور اور ان چیزوں کا تذکرہ کیا ہے۔

اس مقالہ میں اہم ترین امور کے بارے میں تحقیق و تجزیہ پیش کیا گیا اور یہ معلوم ہو گیا کہ اجتماعی و سماجی نظام کا قیام اور اخلاقی اقدار پر اس کا اثر اسی وقت ثمر بخش ہے جب معاشرے میں موجود افراد کی اخلاقی تربیت کی کوشش کی جائے، ورنہ یہ کوشش و تلاش یا تو اثر بخش نہیں ہو گی یا پائدار و دیرپا نہیں ہو گی۔ جس معاشرہ میں بنیادی و اخلاقی اقدار دن بدن برجستہ و ظاہر ہوں اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بنیں اس معاشرے میں اجتماعی نظام میں تبدیلی، دوسرے اخلاقی اقدار کے توسعہ اور اس کی تثبیت کی صورت میں واضح طور سے دیکھے جاسکتے ہیں۔

فہرست منابع

قرآن کریم

۱۔ابن خلدون، عبدالرحمٰن (۱۳۷۴) مقدمہ ابن خلدون، مترجم، محمد پروین گنابادی، ۲ جلد، تہران، شرکت انتشارات علمی و فرہنگی.

۲۔ابن فارس، احمد (۱۴۰۴) معجم مقاییس اللغہ، ۶ جلد، قم، مکتب الاعلام الاسلامی.

۳۔ارسطو (۱۳۴۹) سیاست، مترجم، حمید عنایت، ۱ جلد، تہران، امیر کبیر.

۴۔افلاطون (۱۳۳۵) جمہوری، مترجم، فؤاد روحانی، ۱ جلد، تہران، بنگاہ نشر و ترجمہ کتاب.

۵۔ بیضاوی، عبداللہ بن عمر (۱۴۱۸) انوار التنزیل و اسرار التأویل، محقق، محمد عبد الرحمٰن مرعشی، ۵ جلد، بیروت: دار احیاء التراث العربی.
۶۔ تمیمی آمدی، عبدالواحد بن محمد (۱۴۱۰) غرر الحکم و درر الکلم، محقق، سید مہدی رجائی، ۱ جلد، قم، دار الکتاب الاسلامی.
۷۔ جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۸۹) جامعہ در قرآن، محقق، مصطفیٰ خلیلی، ۱ جلد، قم، مرکز نشر اسراء.
۸۔ سید رضی، محمد بن حسین (۱۴۱۴) نہج البلاغۃ، محقق، صبحی صالح، ۱ جلد، قم، ہجرت.
۹۔ طباطبائی، سید محمد حسین (۱۴۱۷) المیزان فی تفسیر القرآن، ۲۰ جلد، قم، دفتر اسلامی.
۱۰۔ طبرسی، فضل بن حسن (۱۳۷۲) مجمع البیان فی تفسیر القرآن، ۱۰ جلد، تہران، ناصر خسرو.
۱۱۔ طوسی، محمد بن حسن (بی تا) التبیان فی تفسیر القرآن، محقق، احمد قصیر عاملی، ۱۰ جلد، بیروت، دار احیاء التراث العربی.
۱۲۔ عسکری، حسن بن عبداللہ (۱۴۰۰) الفروق فی اللغۃ، ۱ جلد، بیروت، دار الآفاق الجدیدۃ.
۱۳۔ علیزادہ، مہدی (۱۳۸۹) اخلاق اسلامی مبانی و مفاہیم، ۱ جلد، قم، دفتر نشر معارف.
۱۴۔ فارابی، ابو نصر (۲۰۰۲) آراء اہل المدینۃ الفاضلہ، ۱ جلد، بیروت، دار و مکتبۃ الہلال.
۱۵۔ لیثی واسطی، علی (۱۳۷۶) عیون الحکم و المواعظ، محقق، حسین حسنی بیرجندی، ۱ جلد، قم، دار الحدیث.
۱۶۔ مدرسی، سید محمد تقی، ۱۳۷۷ش، تفسیر ہدایت، ۱۸ جلد، مشہد، بنیاد پژوہشہای اسلامی آستان قدس رضوی.
۱۷۔ مصباح یزدی، محمد تقی (۱۳۹۴) اخلاق در قرآن، ۱ جلد، قم: مؤسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینی.
۱۸۔ مصباح یزدی، محمد تقی (۱۳۸۸) جامعہ و تاریخ از دیدگاہ قرآن، ۱ جلد، تہران، سازمان تبلیغات اسلامی، شرکت چاپ و نشر بین الملل.
۱۹۔ مصطفوی، حسن (۱۳۶۸) التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، ۱۴ جلد، تہران، وزارت فرہنگ و ارشاد اسلامی.
۲۰۔ مطہری، مرتضی (۱۳۸۰) مجموعہ آثار، ۲۷ جلد، تہران، صدرا.
۲۱۔ مغنیہ، محمد جواد (۱۴۲۴) تفسیر الکاشف، ۷ جلد، تہران، دار الکتب الاسلامیۃ.
۲۲۔ مکارم شیرازی، ناصر (۱۳۷۴) تفسیر نمونہ، ۲۷ جلد، تہران، دار الکتب الاسلامیۃ.
۲۳۔ نراقی، مہدی بن ابی ذر (بی تا) جامع السعادات، ۳ جلد، بیروت، مؤسسۃ الأعلمی للمطبوعات